بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح بیرونِ ملک اسلام دشمن طاقتیں پاکستان میں حالیہ انتخابات کے نتائج پر بڑی مسرور نظر آتی ہیں اور انہیں غلط فہمی سے دین پر لادینیت کی فتح تصور کرتی ہیں، بالکل اسی طرح اندرونِ ملک بھی ملتِ اسلامیہ اور دینِ حق کے دشمن گھی کے چراغ جلا رہے ہیں۔ وہ خوشی میں اس قدر بدمست ہو گئے ہیں کہ انہیں یہ احساس تک نہیں رہا کہ ان کی زبان اور قلم سے کیا کیا باتیں نکل رہی ہیں اور ان کے دلوں کا کینہ اور بغض کس طرح اُچھل اُچھل کر باہر آ رہا ہے۔ ان لوگوں میں یوں تو کئی قسم کے عناصر شامل ہیں لیکن ان میں سب سے پیش پیش قادیانی ہیں۔ وہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کی کامیابی کو اپنے برحق ہونے کی زندہ نشانی تصور کرتے ہیں۔ چند روز ہوتے ربوہ کے سرکاری گزٹ کے مدیر کا ایک خط دفتر ترجمان القرآن میں موصول ہوا۔ ہم اس خط کو مدیر موصوف کی خواہش کے مطابق من وعن شائع کر رہے ہیں جس سے ان لوگوں کی ذہنی پرواز کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں کے بہت سے دینداروں کے ساتھ جماعت اسلامی کی شکست پر خوش ہونے میں اور کون کون شریک ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

مکرم جناب عبدالحمید صاحب صدیقی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مَیں اکثر ترجمان القرآن میں آپ کے "اشارات" کا مطالعہ کرتا ہوں۔ چنانچہ شمارہ جنوری ۱۹۷۱ء کے اشارات بھی مَیں نے پڑھے ہیں۔ مَیں یہاں آپ کے آخری فقرہ کو پیش

کرتا ہوں جو حسب ذیل ہے:

"آگے نتائج اُس ذات پاک کے ہاتھ میں ہیں جو مالک الملک ہے اور جس نے فیصلے کے اختیارات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے ہیں۔ بندوں کو سونپ نہیں دیئے ہیں۔"

مجھے یقین ہے کہ آپ نے یہ فقرہ محض رسماً نہیں لکھا۔ اگر میرا خیال درست ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ جماعت احمدیہ کے تعلق میں آپ "دو نشان" اب تک دیکھ چکے ہیں۔

(۱) پہلا نشان آپ نے ۱۹۵۳ء میں دیکھا تھا جب آٹھ مطالبوں کے ساتھ نانواں مطالبہ آپ نے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت دلانے کا احرار کی تقلید میں ملا لیا تھا۔

نتیجہ۔ آپ کو سخت شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی پھانسی چڑھتے چڑھتے رحم کی بنا پر چھوڑ دیئے گئے۔

(۲) موجودہ انتخابات کے منشور میں آپ نے پھر وہی "احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی مد بھی شامل رکھی۔

نتیجہ:۔ آپ کی سیاسی وفات۔

الغرض نتائج اُس پاک ذات کے ہاتھ میں ہیں جو مالک الملک ہے۔ اس دفعہ آپ کی تیاریاں بہت زیادہ اور محکم تھیں۔ آپ کے طرفدار اخبارات میں سب کچھ محفوظ ہے۔ ایک بار ان کو پھر ملاحظہ فرمائیں۔

صحیح اور سعید روحوں کے لیے یہ "دو نشان" کافی سے زیادہ ہیں ورنہ صدیق کے لیے جس کے آپ نام لیوا ہیں ایک نشان کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

مجھے یقین ہے کہ آپ یہ دو عظیم نشان دیکھ کر ضرور عبرت حاصل کریں گے اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم کو بھی صحیح راستہ دکھائے۔ آمین

آپ کا اور اپنا خیر خواہ

خاکسار روشن دین تنویر ایڈیٹر الفضل ۷۱/۱/۷

نوٹ: اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو اپنے اشارات میں میرے عریضہ پر تنقید کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ میرا خط مکمل شائع کریں۔ ورنہ نہیں۔

اس قسم کی غلط نشانیوں کا تذکرہ اور ان سے غلط نتائج اخذ کرنا قادیانی امّت کے لیے کوئی نئی چیز نہیں یہ اس کا دلپسند مشغلہ ہے اور وہ اوّل روز سے اس نوعیت کے منطقی مغالطوں میں اُلجھ کر اس طرح کی غلط باتیں کرنے کی عادی ہے۔ اُس کی اِس خاص "نشانی" سے تو پوری دنیائے اسلام واقف ہے کہ اس نے ہمیشہ حق کے مقابلے میں باطل قوتوں کا ساتھ دیا۔ جب تک انگریز اس ملک پر مسلط رہا قادیانی اس کے دعاگو رہے اور امّتِ مُسلمہ جب بھی اس کے ظلم و استبداد کا تختہ مشق بنی تو انہوں نے نہ صرف اس ظالم کی کھلے طور پر تائید و حمایت کی بلکہ اسے اپنی فتح مندی سمجھ کر خوشی کے شادیانے بجائے۔ بغداد اور بیت المقدس پر انگریزوں کے قبضے اور جنگ میں ترکوں کی شکست پر جو دلی راحت اور فرحت انہیں محسوس ہوئی اور جس جوش کے ساتھ انہوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا اس سے کون مسلمان ناواقف ہے۔ وہ بھی اُن کی نظر میں اپنے برحق ہونے کی ایک نشانی تھی۔ اسی طرح کے دو تازہ "نشانات" کا آپ نے اب اپنے خط میں ذکر فرمایا ہے یقین کیجیے کہ ان دونوں نشانات کو آپ کی طرح ہم نے بھی اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور انہیں ہم آپ کے برحق ہونے کے "نشانات" نہیں بلکہ اس بات کے نشانات سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں آپ نے وہی مقام حاصل کر لیا ہے جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے۔ اور آپ لوگوں کی سازشیں یہاں اسی طرح پھیل چکی ہیں جس طرح وہاں یہودیوں کی سازشیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر یہودیوں کا اسرائیل کی ریاست قائم کر لینا اور تمام عرب ریاستوں کو ننگی کا ناچ نچانا اور امریکہ جیسی بڑی حکومت کے سر پر سوار ہو کر اس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا اس بات کا ثبوت قرار دیا جا سکتا ہے کہ انہیں تائیدِ الٰہی حاصل ہے تو بلاشبہ آپ کا ۵۳ء میں غلام محمد اور سکندر مرزا کے ساتھ اور اب پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر اپنی سازشوں میں کامیاب ہو جانا بھی تائیدِ الٰہی کا نشان سمجھا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں کو پاکستان میں اُن پارٹیوں کا ساتھ دیتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی جن کے اندر ایک بہت بڑی تعداد خدا، رسول اور آخرت کا مذاق اڑانے والوں کی شامل ہے اور جو علانیہ یہاں سوشلسٹ نظام قائم کرنے کے ارادے ظاہر کرتی ہیں

اُن سے ہم یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ اپنی اِن کامیاب چالوں کو تائیدِ الٰہی کا نشان قرار دینے میں کوئی شرم محسوس کریں گے۔

جماعت اسلامی سے آپ لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ آپ کو "غیر مسلم اقلیت" قرار دینا چاہتی ہے۔ لیکن آپ لوگ کبھی ٹھنڈے دل سے نہیں سوچتے کہ یہ آپ کے اپنے ہی مذہبی عقیدے کا لازمی نتیجہ ہے۔ آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک اور نبی کی نبوت کے قائل ہیں اور ہر اس شخص کو کافر قرار دیتے ہیں جو اس کی نبوت پر ایمان نہ لائے۔ یہ نئی نبوت ایک ایسی دیوار ہے جس نے آپ کو تمام دنیا کے اُن مسلمانوں سے الگ کر دیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے ہر شخص کو کاذب اور اس پر ایمان لانے والوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ یہ دیوار آپ کے عقیدے کی بنا پر بھی، اور مسلمانانِ عالم کے عقیدے کی بنا پر بھی، ایسی ناقابلِ عبور ہے کہ اس کی موجودگی میں آپ اور ہم ایک امت میں کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتے۔ نبوت کے دعوے سے یہ نتیجہ آپ سے آپ نکلتا ہے کہ جو اس کو مانے وہ ایک اُمت ہو، اور جو اس کو نہ مانے وہ دوسری اُمت۔ اِس چیز کا دعویٰ لے کر جب ایک شخص اُٹھ چکا ہے تو لامحالہ اسے سچا سمجھنے والوں کے نزدیک وہ سب لوگ کافر ہونے چاہییں جو اسے جھوٹا سمجھیں۔ اور اسی طرح اسے جھوٹا سمجھنے والوں کے نزدیک بھی وہ سب لوگ کافر ہونے چاہییں جو اسے سچا سمجھیں۔ اب جبکہ یہ صورتِ حال ایک امر واقعی کے طور پر موجود ہے تو آخر آپ لوگ اسے تسلیم کرنے سے گریز کیوں کرتے ہیں؟ آپ کو سیدھی طرح یہ مان لینا چاہیے کہ مرزا غلام احمد کی نبوت کے منکرین آپ کے عقیدے کی رُو سے غیر مسلم اکثریت ہیں، اور اس پر ایمان لانے والے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے عقیدے کی رُو سے غیر مسلم اقلیت۔

اسی سلسلے میں، میں آپ سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر آپ کو جھوٹ بولنے میں غیر معمولی لذت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ کیا آپ اس امر سے ناواقف ہیں کہ مولانا مودودی کا پھانسی کے تختے سے بچنا کسی رحم کی بنا پر نہیں تھا بلکہ کارسازِ حقیقی کی قدرت کا کرشمہ تھا؟ پوری دنیا کو یہ بات معلوم ہے کہ آپ لوگوں نے غلام محمد اور سکندر مرزا کے ساتھ مل کر کیا سازش کی تھی اور سب لوگ اس بات کو بھی اچھی طرح

جانتے ہیں کہ مولانا محترم نے بعض حضرات کے اصرار کے باوجود رحم کی اپیل کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجھے اب تک وہ الفاظ اور منظر یاد ہے جب مولانا نے پھانسی کی کوٹھڑی میں رحم کی اپیل داخل کرنے سے شدید اختلاف کرتے ہوئے اپنے صاحبزادے سے مخاطب ہو کر یوں فرمایا:

"بیٹے! میں ظالموں سے رحم کی اپیل نہیں کرنا چاہتا۔ انسان کی زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ اگر میرے مالک کو مجھے بچانا ہے تو یہ لوگ اُلٹے بھی لٹک جائیں تو میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر وہاں سے میرے بلاوے کا حکم آگیا ہے تو پھر ساری دنیا مل کر بھی مجھے نہیں بچا سکتی۔"

پُورا ملک اس بات پر گواہ ہے کہ حکومت نے تمام دنیائے اسلام سے لعنت اور پھٹکار کی بارش ہونے کے بعد اس سزا کو از خود عمر قید کی سزا میں تبدیل کیا تھا، اور اس عمر قید سے رہائی بھی کسی کے رحم کی بنا پر نہیں ہوئی تھی بلکہ اس قانونی نکتے کی بنا پر ہوئی تھی کہ تمیز الدین کیس میں فیڈرل کورٹ نے دستور ساز اسمبلی کے پاس کردہ اُن تمام قوانین کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا جن پر گورنر جنرل کے دستخط نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ انڈمنٹی ایکٹ (INDEMNITY-ACT) بھی ان قوانین میں شامل تھا اس لیے مارشل لا کی عدالت کا وہ فیصلہ بھی آپ سے آپ ختم ہو گیا جس کے تحت مولانا مودودی صاحب کو سزا دی گئی تھی اور جس کی دی ہوئی سزا کو مارشل لا اُٹھنے کے بعد انڈمنٹی ایکٹ کی رُو سے برقرار رکھا گیا تھا۔ اب کیا آپ یہ بتائیں گے کہ آپ کو اس حقیقت کا علم نہ تھا، یا آپ نے جان بوجھ کر ایک مقتدر ہستی کے بارے میں یہ من گھڑت بات کہہ دی ہے کہ اسے رحم کی بنا پر چھوڑا گیا تھا؟

"آپ نے مجھے "صِدّیق" کی نسبت سے یاد فرمایا ہے، سو اس کے متعلق عرض ہے کہ میں اپنے آپ کو اِس مقدس ہستی کے خاکِ پا کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ مگر شاید یہ اُنہی کا فیضان ہے کہ مَیں وقت کے فتنوں سے متاثر نہیں ہوتا اور کسی فتنے کی ظاہری قوت مجھے مرعوب نہیں کرتی۔ مَیں ان سارے فتنوں کو مانعینِ زکوٰۃ کے فتنے کی طرح دنیا پرستوں اور زر و مال کے پجاریوں کی شورش خیال کرتا ہوں

انتخابات میں جماعت اسلامی کو مرکزی اور صوبائی ایوانوں میں حسبِ توقع نشستیں حاصل کرنے میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کے اسباب پر گذشتہ ترجمان القرآن میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس ناکامی کے بارے میں مخالفوں، بہی خواہوں، سب نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ جہاں تک مخالفین کا تعلق ہے ان کے خیالات کا بھی ہم نے بغور مطالعہ کیا اور دیانتداری سے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ اگر انہوں نے کوئی صحیح اور معقول بات کی ہو تو اسے قبول کر لیا جائے اور جماعت کے اربابِ حل و عقد کو اس کی طرف توجہ دلائی جائے۔ مگر اُن کی آراء سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے لیے جماعت اسلامی اور اس کے محترم امیر کا وجود ہی گوارا نہیں۔ اس لیے ہم ان مخالفین کی آراء کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں۔ مگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ جماعت کے بعض خیر خواہوں کے دل میں بھی جماعت کی موجودہ ہیئت اور پالیسی کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں اور وہ ان دونوں کے اندر تبدیلی کے آرزومند ہیں۔ ہم ان کے ان مشوروں اور ان کے نیک جذبات کی قدر کرتے ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی ضدی اور ہٹ دھرم لوگ نہیں ہیں کہ جان بوجھ کر ایک غلط راہ پر چلنے پر مُصر ہوں اور بھلائی کی بات سننے اور قبول کرنے میں ہمیں کوئی تامّل ہو۔ ایک خادمِ دین جماعت جو محض اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے اپنے وسائل کی حد تک کوشش کر رہی ہے اسے آخر صحیح بات اور نیک مشورہ قبول کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ خیر خواہی اور محبت سے پیش کیے جانے والا ہر مشورہ سو فیصد صحیح بھی ہو۔ ہمیں امید ہے کہ جن اچھے جذبات کے ساتھ انہوں نے اپنے قیمتی مشورے دیئے ہیں انہی جذبات کے ساتھ وہ ہماری گزارشات پر بھی غور کریں گے۔

جماعت اسلامی کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ جسے ہمارے اکثر و بیشتر خیر خواہ نظر انداز کر رہے ہیں وہ بین الاقوامی حالات کی ناسازگاری ہے۔ وہ خارجی قوتیں جو اس وقت اسلام اور خصوصاً احیاءِ اسلام کی ہر اُبھرنے والی تحریک کے خلاف دنیا بھر میں کارفرما ہیں ان کی وسعت اور اثر آفرینی کا ٹھیک طور پر اندازہ نہیں کیا جاتا۔ پوری دنیا اگرچہ اس وقت دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے مگر عملاً ان دونوں کیمپوں میں ایک ہی نظام کے تسلّط اور حفظ و بقا کے لیے سپاہ تیار کی جا رہی ہے اور وہ ہے نظامِ مادیت

اس نظام کے افکار و نظریات کی فنی پیچیدگیوں کو چھوڑ دیا جائے تو اسے مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ نظامِ مادیت ایک ایسا ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جس میں عمل کے محرکات، خوب و ناخوب کے پیمانوں اور مقصد و منہاج کا تعین سراسر دنیوی اور مادی سُود و زیاں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں جو چیز بانظریہ اس بنیاد سے بے تعلق ہے وہ بالکل غیر ضروری اور بے اثر ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ اس نظام کے ماننے والے منکرِ خدا، دہریے اور کافر ہی ہوں، مگر یہ بات ضروری ہے کہ وہ اجتماعی زندگی پر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی پرچھائیں تک پڑنے نہیں دیتے۔ اگر ان پر ایمانیات کا کوئی معمولی اثر ہوتا بھی ہے تو وہ اُن کے دل کے کسی گوشے میں ہوتا ہے، ان کی حیاتِ اجتماعی دینی اور مذہبی اثرات سے یکسر خالی رہتی ہے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اجتماعیت پسندانہ سرمایہ داری میں جسے لوگ اشتراکیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، روح، مزاج اور مقصد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ فرق جو کچھ ہے وہ صرف طریقِ کار کا ہے۔ جس مقصد کو سرمایہ دارانہ نظام آہستہ آہستہ انفرادی تگ و دو اور منافع کے محرکات سے آگے بڑھاتا ہے۔ اسی مقصد کو اشتراکیت بڑی برق رفتاری سے اجتماعی جکڑ بندیوں اور اجتماعی مفادات کے خوش کُن دعووں کے فریب دے کر حاصل کرتی ہے۔ یہ مادی نظام کہیں اشتراکیت کے روپ میں اور کہیں جمہوریت کے نام پر اس وقت پوری دنیا پر مسلط ہے۔ یہ وقت کا غالب نظام ہے اور اس نظام کا اس وقت صرف سیاسی تسلط ہی قائم نہیں بلکہ اس نظام کے غلبے کے ساتھ دنیا میں جو افکار و نظریات پروان چڑھے ہیں، جس تہذیب و تمدن کو بالادستی حاصل ہوئی ہے، جن اخلاقی معیارات کا عام چلن ہوا ہے، انہیں بھی آج پوری دنیا میں تفوق و برتری حاصل ہے۔ ایک انسان جب سانس لیتا ہے تو اس نظام کے جراثیم خود بخود اس کے حلق میں اُتر جاتے ہیں۔ وہ جب نگاہ اٹھا کر اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے تو اس نظام کے مختلف مناظر اس کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے ہر طرف موجود ہوتے ہیں۔ وہ جب کان کھول کر آواز سننا چاہتا ہے تو اس نظام کی گونج ہی اُسے سنائی دیتی ہے۔ آخر غور کریں کہ عقلیت پسندی کی یہ مختلف تحریکات فلسفہ، نفسیات اور ادب کے موجودہ رجحانات، قانون و اخلاق کے مروجہ نظریات، معیشت، معاشرت اور

سیاست کے مختلف تصورات اور ان تصورات کو بروئے کار لانے کی مختلف عملی تدبیریں کس نظامِ حیات کو تقویت بہم پہنچاتی ہیں؟ اور ان افکار و نظریات نے عوام خصوصاً پڑھے لکھے طبقوں کے دل و دماغ کو کس حد تک مرعوب کر رکھا ہے؟ ان باطل تصورات کے سیلِ بے پناہ نے صرف دنیائے مغرب ہی میں دینی اقدار کو برباد نہیں کیا بلکہ پورے عالمِ اسلام کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ دنیا کا کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جو باطل کے اس سیلاب کی زد سے محفوظ ہو۔ دوسرے ممالک کو تو ایک طرف رہنے دیجیے، خود وہ ممالک جن کی سربراہی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب اسّی اور نوے فیصد ہے وہاں بھی مادّی نظامِ حیات کی عملداری اپنی ساری گمراہیوں کے ساتھ قائم ہے۔

اب جو تحریکیں اس سیلاب کو روکنے کے لیے کام کر رہی ہیں ان کی بے بسی ملاحظہ فرمائیں۔ ایک طرف تو انہیں وقت کے غالب افکار و رجحانات اور تصورات کے خلاف جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف اس جدوجہد کے لیے انہیں جس قدر وسائل درکار ہوتے ہیں اُن کا عشرِ عشیر تو کیا ان کا کروڑواں حصہ بھی فراہم نہیں ہوتا۔ پھر ان کے تسلّط کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں جو مرعوبیت بلکہ مغلوبیت پائی جاتی ہے اُس سے بھی انہیں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اِس پر مزید یہ کہ اس باطل نظام نے اپنی عملداری کے لیے زیرِ زمین بھی اور بالائے زمین بھی، سازشوں کا ایک نہایت ہی وسیع اور پیچیدہ نظم قائم کر رکھا ہے جس کے لیے ملک کے اندر بھی بہت سی طاقتیں کام کر رہی ہیں اور ملک کے باہر سے عالمی طاقتیں بھی ان کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ یہ تحریکات تعداد میں اس قدر زیادہ اور اپنے پروگراموں کے اعتبار سے اس قدر وسیع اور طریقہائے کار کے لحاظ سے اتنی متنوع اور اثرات کے اعتبار سے اتنی ہمہ گیر ہیں کہ اسلامی تحریکوں کے لیے ان کا مقابلہ عالمِ اسباب میں جوئے شیر لانے سے کچھ کم دشوار نہیں ہے۔ جونہی کوئی دینی تحریک معرضِ وجود میں آتی ہے اسی وقت تمام اسلام دشمن تحریکیں مل کر اسے برباد کرنے کے لیے اپنے پروگرام لے کر میدان میں آجاتی ہیں اور ہر طرف سے اس پر یلغار کرتی ہیں۔ آپ سوچیے کہ مصر میں اخوان المسلمین کا جو حشر ہوا ہے اور اس کے خلاف دنیا میں حقارت و نفرت کے جو جذبات پھیلے ہیں اور اس کی بربادی پر دنیا کے مختلف ممالک اور طبقوں میں

خوشی کے جو شادیانے بجے ہیں کیا وہ محض مصر کے چند حکمرانوں کی کوششوں کے نتائج ہیں؟

اسی پس منظر میں ذرا جماعتِ اسلامی کی مشکلات کا بھی اندازہ لگائیے۔ ڈھائی ہزار ارکان پر مشتمل ایک چھوٹی سی جماعت، جس کے ہمدردوں کی تعداد چند لاکھ نفوس سے زیادہ نہیں ہے جس کے وسائل انتہائی قلیل ہیں اور جس کی مادّی قوت نہایت ہی کم ہے، اس کے پیچھے ایک دنیا ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہے۔ جن لوگوں نے امریکہ، انگلستان، روس اور فرانس کے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر انتخابات کے متعلق تبصرے پڑھے یا سُنے ہیں انہیں اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کی شکست پر ان ممالک نے کس قدر اطمینان کا سانس لیا ہے۔ پھر اندرونِ ملک اس جماعت سے جو ناروا سلوک کیا جاتا رہا ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے پچھلے چوبیس سال میں ہمارے ہاں مختلف قسم کے رجحانات رکھنے والی حکومتیں قائم ہوئی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ہمارے حکمران امریکہ بہادر سے ہر معاملے میں صلاح مشورہ لیا کرتے تھے اور اس ملک کی داخلی اور خارجی پالیسیوں کی تشکیل میں اس کا اچھا خاصا دخل تھا۔ اس دَور میں بھی جماعت اسلامی باقاعدہ موردِ الزام رہی اور اس پر مسلسل عتاب نازل ہوتا رہا۔ پھر رجحانات کے اندر تبدیلی پیدا ہوئی اور اشتراکی ممالک خصوصاً روس اور چین کا اثر بڑھا مگر جماعت اسلامی کے معاملے میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا، اسے برابر ظلم و ستم ہی کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ جب بُری بھلی جمہوریت تھی، اس وقت بھی حکومت کی طاقتیں اسے دبانے اور مٹانے پر صرف ہوتی رہیں، اور جب آمریت آئی تو اس نے بھی سارا زور اس کے خلاف لگا دیا۔ اس پوری مدت میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب حکومت کی پالیسی میں اس کے لیے کوئی نرمی پیدا ہوئی ہو۔

حکومت کی سطح سے نیچے اُتر کر دیکھیے تو جماعت کو کبھی اطمینان اور چین سے کام کرنے کا موقع نہ دیا گیا۔ ملک میں جتنے لادین اور گمراہ عناصر تھے سب نے متفق ہو کر اسے تباہ کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا، اور یہ عجیب بات ہے کہ ان کے ہر وار پر نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ باہر کے ممالک میں بھی تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسائے جاتے رہے۔ بین الاقوامی پریس ان اسلام دشمن عناصر کے

کارنامے اُچھال اُچھال کر سامنے لاتا رہا اور دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا رہا کہ جماعت تاریک خیال اور تنگ نظر اور رجعت پسند افراد کا ایک ٹولہ ہے جو مذہبی تعصبات اُبھار کر پاکستان میں تھیا کریسی قائم کرنا چاہتا ہے جس سے زیادہ قابلِ نفرت کوئی چیز اہلِ مغرب اور اشتراکی دنیا کی نگاہ میں نہیں ہے۔

پھر ان عناصر نے بڑی عیاری کے ساتھ جماعت اسلامی کی عداوت و مخالفت کے محاذ پر علماء کے ایک نہایت مُنہ پھٹ طبقے کو لا کھڑا کیا اور ان کے مزاج کی مناسبت سے اُنہیں ایک ایسے مورچے پر یلغار کرنے کے لیے متعین کیا جہاں سے جماعت کی دینی حیثیت کو، جو اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، زبردست نقصان پہنچایا جا سکتا ہو۔ چنانچہ یہ طبقہ نتائج سے یکسر غافل اور خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے بالکل فارغ ہو کر اس خادمِ دین جماعت کو بدنام کرنے میں منہمک ہو گیا اور اس کام میں اس کے انہماک کا یہ عالم ہے کہ اسے جماعت اسلامی اور اس کے امیر کے خلاف کوئی جھوٹ بولنے اور کوئی بہتان لگانے اور کوئی تہذیب و شرافت سے گری ہوئی زبان استعمال کرنے میں ذرا تامل نہیں ہے۔ اس کو دنیا میں جماعت اسلامی کے سوا کوئی فتنہ نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اس بے دین طبقے کے ہاتھوں خوب چوٹیں کھا لینے کے باوجود علماء کے اس طبقے کی آنکھیں نہیں کھُلیں اور وہ اب بھی جماعت کے خلاف تن، من، دھن سے مصروفِ عمل ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا جماعت اسلامی کے خلاف اس قدر منظم اور وسیع پیمانے پر کوشش محض ملکی وسائل کے بل بوتے پر کی جا سکتی ہے؟ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ دیندار طبقے جو اس "کارِ خیر" میں مصروف ہیں ان کے ہر فرد کو شاید اس بات کا صحیح شعور نہ ہو کہ وہ کن چھپے ہوئے ہاتھوں کے اشارے پر بالکل نادانستہ طور پر یہ سب کچھ کارروائیاں کر رہا ہے مگر بہرحال اس کا فائدہ تو دشمنِ دین عناصر کو پہنچ ہی رہا ہے اور باطل کی قوت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اتنے ہمہ گیر طوفان کا مقابلہ آخر ایک کمزور سی جماعت کہاں تک کر سکتی ہے؟

پھر اس معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ انسانوں کی عظیم اکثریت کسی نظریے کو خواہ وہ کتنا ہی صحیح اور برحق ہو اس وقت تک قبول کرنے میں تامل کرتی ہے جب تک کہ وہ عالمِ واقعات میں ٹھوس

نتائج پیدا نہیں کر دیتا۔ مجرد حقائق کو آغاز میں ماننے والے ہمیشہ قلیل تعداد میں ہوتے ہیں۔ عوام اُن کی طرف اُس وقت لپکتے ہیں جب وہ حقائق پیکرِ محسوس میں ڈھل کر انسانوں کے سامنے نمودار ہونے لگیں اور ان کے اندر اپنی فلاح و بہبود کے آثار انہیں نظر آنے لگیں۔ اگر پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہاں اسلامی نظام کے قیام کی پُورے خلوصِ نیت سے کوششیں شروع ہو جاتیں اور ان کے نتیجے میں یہاں فی الحقیقت یہ نظام قائم ہو جاتا اور عوام زندگی کے ہر شعبے میں اس کی برکات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے اور اس کی رحمتوں کو اپنی روح کے اندر پُوری طرح محسوس کر سکتے تو پھر اس بات کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ یہ پُورا ملک باطل نظام کے خلاف ایک زبردست محاذ بن جاتا اور یہاں کا ہر فرد دوسرے نظاموں کے خلاف ٹکرانے اور انھیں برباد کرنے کے لیے بیتاب ہوتا۔ مگر یہاں عملاً جو کچھ ہوا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس خطۂ پاک میں جگہ جگہ اسلام کو برباد کرنے کے لیے کفر کے مورچے قائم کیے جاتے رہے ہیں۔ آپ تعلیمی درسگاہوں، نشریاتی اداروں اور ابلاغ کے دوسرے ذرائع کا جائزہ لیجیے اور دیکھیے کہ ان سب کا مقصود کیا ہے؟ ان کی تربیت سے حق کے سپاہی تیار ہوتے ہیں یا اُن کے فیض سے باطل کے علمبرداروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے؟

ان سب حالات کا وزن ایک پلڑے میں ڈالیے اور دوسرے پلڑے میں جماعت اسلامی کی معمولی قوت کو ڈال کر پھر انصاف سے اندازہ کیجیے کہ اس میں جماعت کی داخلی کمزوریوں کا کتنا دخل ہے اور جس نہج پر آج اس کے کام اور نظام میں تبدیلیاں تجویز کی جا رہی ہیں کیا ان سے بہتر نتائج برآمد ہونے کی کوئی توقع ہو سکتی ہے؟ انقلاب بذاتِ خود مشکل کام ہے، مگر خاص طور پر اسلامی انقلاب تو ایک نہایت ہی صبر آزما کام ہے جسے برپا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ اسلامی نظامِ حیات مادّی نظام کے بالکل برعکس ایک دوسرا نظام ہے۔ مادّی نظام میں اگر عمل کے محرکات مادّی منافع ہیں تو یہاں عمل کا واحد محرک رضائے الٰہی ہے۔ اُس نظام میں اگر فلاح و کامرانی کا تصور مادّی آسائش و آرام سے عبارت ہے تو اسلامی نظامِ حیات میں فلاح کا تصور آخرت کی فلاح سے وابستہ ہے۔ مادّی نظام میں اگر اخلاق دنیوی مفادات کے تابع ہے تو اسلامی نظام میں دنیوی مفادات اخلاق کے تابع ہیں۔ مادّی نظام کا سارا تانا بانا

مادّی اقدار سے تیار کیا گیا ہے جبکہ اس کے برعکس اسلامی نظام اوّل تا آخر روحانی اور اخلاقی اقدار پر قائم ہے۔ موجودہ دَور میں مادی نظام کو اس وقت پوری دنیا میں تسلّط حاصل ہے۔ اس سے عوام کی توجہ ہٹا کر ایک ایسے نظام کی طرف مبذول کروانا اور پھر اُس کے بارے میں ان کے دل و دماغ میں ایسی محبت پیدا کرنا کہ وہ خود اس کے علمبردار بن کر اس کی سربلندی کے لیے دیوانہ وار آگے بڑھنے پر آمادہ ہو جائیں، بڑا کٹھن کام ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان تو کوئی نوعی فرق نہیں بلکہ یہ دونوں ایک ہی ہنج کے ارتقاء کی دو مختلف منازل ہیں، اور جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے، دونوں میں وہ بالکل مشترک ہے، پھر بھی ان دونوں نظاموں کے درمیان اِس تھوڑے سے فاصلے کو طے کرنے کے لیے اندازہ لگائیں کہ اشتراکیہ کو جان و مال کی کس قدر زیادہ قربانیاں کرنی پڑی ہیں۔ مگر ہم جس نظام کو برپا کرنے کا عزم رکھتے ہیں اس نظام اور مروجہ نظاموں کے درمیان بے انتہا فاصلہ ہے۔ ان میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ان کے مقاصد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے مزاج ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان وسیع اختلافات کے ہوتے ہوئے اسباب کی دنیا میں آسانی کے ساتھ کسی غیر معمولی کامیابی کی توقع کرنا حالات کی سنگینی کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔

ممکن ہے کہ حالات کی جو تصویر کشی ہم نے کی ہے اُسے دیکھتے ہوئے کسی شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ان حالات میں اسلامی انقلاب برپا ہونے کا تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہماری ان گزارشات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے۔ اگر کچھ اسباب ہمارے خلاف کام کر رہے ہیں اور ہم اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کو انہیں پیشِ نظر رکھنے کا مشورہ دے رہے ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم انہیں لازمی طور پر کسی ہرنے والی بازی کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ انہیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ حق بذاتِ خود ایک بہت بڑی قوت ہے خواہ لوگ اسے تسلیم کریں یا اس سے انکار کریں۔ اس لیے ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ دنیا میں حق کا علمبردار بن کر زندہ رہے اور حق کی سربلندی کے لیے جان دے۔ یہی وہ فرض ہے جس کی ادائیگی اُمتِ وَسط کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتی ہے۔ ہم

سخت خسارے کا سودا کریں گے اگر حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اپنے اصل فرض سے غافل ہو جائیں اور صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راستوں پر چل پڑیں۔ دنیا میں کتنے ایسے انبیاء اور صلحا گزرے ہیں جو کوشش کے باوجود حق و صداقت کو اپنے دَور کی غالب قوت نہ بنا سکے۔ کیا ان مقدس ہستیوں کی کوششوں کو ناکام کہا جا سکتا ہے؟ نیکی اور بھلائی کی ہر کوشش کامیاب ہی ہے بشرطیکہ اسے خلوصِ نیت کے ساتھ کیا جائے۔ یہ کوششیں بہرطور بارآور ہوتی ہیں اور کبھی ناکام نہیں ہوتیں۔ آج دنیا میں شرافت، نیکی اور انصاف کی جو مختلف اقدار قندیلوں کی طرح روشن ہیں وہ سب حق کے علمبرداروں کی تگ و دو ہی کی رہینِ منت ہیں۔ اگر یہ سارے لوگ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے حق و صداقت کی شمع ہاتھ سے چھوڑ دیتے اور ان کی جگہ تاریکیاں پھیلنے پر راضی ہو کر بیٹھ جاتے تو کیا انسانیت کہیں بھی روشنی کی کرن پا سکتی تھی؟

اس سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ باطل بلاشبہ دنیا میں غالب قوت کی حیثیت سے وقتاً فوقتاً اُبھرتا رہتا ہے، مگر اس کے مزاج میں چونکہ تخریب کا عنصر مُضمر ہوتا ہے اس لیے ہر باطل کی قوت خود بخود ٹوٹتی رہتی ہے، اور اس رخنے سے دوسری قوتوں کے ابھرنے کا راستہ نکل آتا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم نے دنیا کی باطل قوتوں کو سخت دھچکا لگایا اور دوسری جنگِ عظیم نے انہیں ادھ مؤا کر کے رکھ دیا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مشرقی ممالک اُن کی گرفت سے آزاد ہو گئے، حالانکہ ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ قوت موجود نہ تھی کہ وہ اپنے وسائل کے بل بوتے پر اُن کے چُنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔ سیاسی قوت کے علاوہ نظامِ باطل کی اخلاقی اور معاشرتی قوت بھی ایک حد تک پہنچنے کے بعد روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ مثلاً امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں آزادی کے نام پر جرائم کی کثرت، اخلاقی بے راہ روی اور خاندانی انتشار نے جو ہولناک صورتِ حال پیدا کی ہے اُس نے ان ممالک کے رہنے والوں کو اچھا خاصا جھنجھوڑا ہے۔ اسی طرح اشتراکی ممالک خصوصاً روس میں منصوبہ بندی نے اجتماعی جکڑ بندیوں کا جو ظالمانہ نظام قائم کیا ہے اس نے خود اس نظام کے علمبرداروں میں اس کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا کر دیا ہے جو لاوے کی صورت میں اندر ہی اندر اُبل رہا ہے اور پھوٹ نکلنے کے لیے بالکل تیار معلوم ہوتا ہے۔ ایسے ہی حالات ہوتے ہیں جب ایک قائم شدہ

غلط نظام میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور کسی تبدیلی کے لیے راستہ نکلتا ہے۔ اگر اس وقت کسی صحت مند تبدیلی کے لیے کام کرنے والے موجود نہ ہوں تو اس راستہ سے کوئی اور غلط تبدیلی آ جاتی ہے۔ ان تمام امکانی مواقع کو نظر انداز کر کے حق کے چراغ جلانے والے مایوس ہو کر بیٹھے رہیں، یا شکست کھا کر باطل کی صفوں میں جا شامل ہوں تو انسانیت کو روشنی آخر کہاں سے ملے گی۔

بلاشبہ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ حق کو دنیا میں غالب کریں، لیکن اگر اس کی کوشش کرنے کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکیں تو کیا پھر انہیں باطل کا پرچم بلند کرنے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے؟ حق تو ایک روشنی ہے جس سے انسانیت راہِ ہدایت پاتی ہے۔ انسان اس روشنی کا ہر لمحہ محتاج ہے مگر اس کی ضرورت اسے سب سے زیادہ اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ہر طرف گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہو اور کہیں سے بھی نور کی کرن دکھائی نہ دیتی ہو۔ آج جب مادی نظامِ حیات نے پوری دنیا کو ایک وسیع ظلمت کدہ بنا رکھا ہے اور باطل کی خوفناک آندھیاں ہر طرف یورش کر رہی ہیں ان حالات میں حق و صداقت کے چراغ ہاتھ میں لے کر ان طوفانوں میں محض کھڑے رہنا بھی دین کی کوئی کم خدمت نہیں ہے کچھ عجب نہیں کہ یہ چراغ اگر جلتا رہے تو باطل کی تاریکیوں میں بھٹکنے والے اس روشنی کو موجود پا کر اس کی طرف خود رجوع کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

بعض مخلصین نے ان انتخابات کے نتائج سے دل برداشتہ ہو کر یہ مشورہ دیا ہے کہ جماعت کو عوامی بنانے کے لیے اس کی شرائطِ رکنیت کو بہت آسان کر دیا جائے ہم اس مشورہ کو بھی صحیح نہیں سمجھتے۔ جماعت اسلامی کے اندر بلاشبہ غیر معمولی قوتِ جاذبہ پیدا ہونی چاہیے اور اس کے لیے جو تدابیر بھی مؤثر ہو سکتی ہیں انہیں بروئے کار لانا چاہیے۔ لیکن اگر رکنیت کی موجودہ کم سے کم شرائط کو آسان کر کے جماعت کو عوامی بنانے کی کوشش کی گئی تو اس سے جماعت کی امتیازی حیثیت ختم ہو جائے گی اور وہ بھی دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح محض ایک سیاسی جماعت بن کر رہ جائے گی۔ اس وقت رکنیت کی جو شرائط موجود ہیں ان کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ وہ کم سے کم شرائط ہیں جن کا اسلام کسی مسلمان سے مطالبہ کرتا ہے۔ کیا فرائض کی ادائیگی کا التزام اور کبائر سے اجتناب کسی مسلمان کے لیے ناقابلِ برداشت بوجھ ہے؟ خصوصاً اس مسلمان کے لیے جو دنیا میں

دینِ حق کو غالب کرنے کا عزم رکھتا ہو؟ اس وقت معاشرے کی عام حالت یہ ہو گئی ہے کہ مسلمانوں کے اندر اسلامی احکام کی اطاعت کا جذبہ بڑی تیزی کے ساتھ سرد پڑتا جا رہا ہے۔ نماز اور روزہ اسلام کے اہم ارکان ہیں۔ ان کے بارے میں عام بے پروائی بلکہ مجرمانہ غفلت کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ احکامِ دین تو ایک طرف رہے عقائد تک کے بارے میں لوگ بعض اوقات ایسی لغو اور بیہودہ باتیں کرنے لگتے ہیں جنھیں آج سے چند سال پیشتر مسلم معاشرے میں کوئی شخص زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ان حالات میں اگر جماعت اپنے ارکان کی تعداد بڑھانے اور اپنے آپ کو سیاسی اعتبار سے وسیع کرنے کے لیے شرائطِ رکنیت کو زیادہ آسان بنا دے تو کیا جماعت احیائے اسلام کے لیے کوئی مؤثر خدمت سرانجام دے سکے گی؟ اگر ہمارا مقصود و مطلوب محض سیاسی اقتدار ہے تو پھر بلاشبہ ہمیں ان پابندیوں کو جلد از جلد ختم کر کے تعداد میں اضافہ کرنے کی فکر کرنی چاہیے لیکن اگر ہمیں اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے مردانِ کار درکار ہیں تو پھر ان پابندیوں کو سخت کرنے کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ چونکہ کمیونسٹ پارٹی اپنے رکنیت کے دائرے کو محدود رکھتی ہے اس لیے اسے انگلستان میں قوت رکھنے کے باوجود انتخابات میں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن جماعت اسلامی کو کمیونسٹ پارٹی پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ ان دونوں جماعتوں میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کا دائرۂ رکنیت اس لیے محدود ہے کہ اس کی سرگرمیوں کا بیشتر حصّہ زیرِ زمین ہوتا ہے۔ اُس کا پروگرام چونکہ اقلیت کو اکثریت پر بالجبر اس کی مرضی کے علی الرغم مسلط کرنا اور آمریت قائم کرنا ہے اس لیے اس کے قابلِ اعتماد کارکن ہمیشہ تھوڑے سے ہی ہوتے ہیں تاکہ وہ چھپ کر تخریبی سرگرمیوں کو بڑے مؤثر طریق سے سرانجام دے سکیں اور ان کی کوئی کارروائی عوام کے سامنے نہ آئے۔ عوام کے دل و دماغ اور ان کے حقوق پر شبخون مارنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دستے ہی مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اس کام کو کوئی بڑا لشکر کامیابی کے ساتھ سرانجام نہیں دے سکتا۔

جماعت اسلامی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں ہر کام دن کے اُجالے میں ہوتا ہے، تاریکی میں عوام کی نگاہوں سے چھپ کر نہیں کیا جاتا۔ ہم تو دل و جان سے ہر شخص کو اُسی دلسوزی کے ساتھ اس

میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں، جس دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ کوئی پابندِ صوم و صلوٰۃ مسلمان اپنے دوسرے بھائی کو جو ان ارکان کا تارک ہے ان کی پابندی کی دعوت دیتا ہے۔ البتہ ہم بالکل فطری طور پر اس سے یہ تقاضا کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جس طرح نماز میں شریک ہونے سے پہلے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ طہارت کے کم سے کم تقاضے پورے کرے تاکہ اس کی نماز ادا ہو جائے بالکل اسی طرح ہم دینِ حق کو دنیا میں سربلند کرنے کا عزم لیکر اٹھنے والوں سے یہ مطالبہ ضرور کرتے ہیں کہ وہ جس دین کو دنیا پر غالب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اسے پہلے اپنی انفرادی زندگی میں اپنانے کی کوشش کریں۔ جو لوگ اپنی انفرادی زندگی میں دین کے کم سے کم تقاضے پورے کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے اُن سے کسی دینی تحریک کو کوئی زیادہ قوت فراہم نہیں ہو سکتی۔

یہ رائے بھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی محدود رکنیت کی وجہ سے چونکہ اُسے انتخابات میں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی، اس لیے جماعت کو بھی انتخابات میں کامیابی کے لیے یہ طرزِ عمل ترک کر دینا چاہیے۔ کمیونزم کی انتخابات میں ناکامی کی وجہ، جیسے ہم پہلے گذارش کر چکے ہیں، اس کا ایک خاص مزاج اور کام کی ایک خاص ٹیکنیک ہے۔ کمیونزم کا مزاج ہی ایسا ہے کہ اُسے کبھی بھی جمہوریت کی فضا راس نہیں آئی۔ اس لیے وہ انقلاب کے جمہوری طریقے سے سخت گھبراتا ہے اور اگر وہ اس طریقہ سے کامیاب ہو بھی جائے تو جمہوری نظام میں ان عزائم کی تکمیل نہیں کر سکتا جو اس کے پیش نظر ہوتے ہیں، حتیٰ کہ جمہوریت کی راہ سے آنیوالا کمیونزم اسی راہ سے رخصت بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کا من بھاتا طریق کار یہ ہے کہ قوم کے اندر بددلی پھیلا کر اور ملک میں ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر کے کسی نہ کسی طرح موقع پا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے اور پھر ایک مختصر سے گروہ کی ایسی آمریت ملک پر مسلط کر دی جائے جو وہاں کے سیاہ سپید کی مالک ہو اور کوئی اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکے۔ پوری قوم بے زبان جانوروں کا ایک گلہ بن کر رہ جائے جسے اقتدار کی اندھی لاٹھی جس طرف چاہے ہانک کر لے جائے۔ اس مزاج کی حامل اور اس طریق کار پر عمل پیرا ہونے والی کوئی تحریک کسی ایسے ملک میں آخر کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے جہاں قومی اور ملکی مسائل جمہوری روایات کے مطابق طے پاتے ہوں؟ اقتصادی بدحالی، انتشار، رشوت ستانی اور نوکر شاہی کے استبداد سے بددلی کی جو فضا قائم ہوتی ہے وہ کمیونزم کو راس آتی ہے اور جہاں یہ فضا موجود نہ ہو وہاں اس نظام کو پھلنے پھولنے کے مواقع میسّر نہیں آسکتے۔ چنانچہ اشتراکی عناصر اگر جمہوری طریق سے کہیں کامیاب بھی ہو جاتیں تو وہ فوراً جمہوریت کی فضا کو برباد کر کے اُسے آمریت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیتے

ہیں۔ آپ پاکستان کو ہی لیجیے۔ یہاں کے دو صوبوں میں ایک ایسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل ہوئی ہے جو اپنے آپ کو اشتراکیت کی حامی کہتی ہے۔ جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ ملک میں امن و امان کی فضا قائم ہو اور اس پارٹی کے ارکان مسندِ اقتدار سنبھالنے کے بعد جمہوری روایات اور طریقوں کے مطابق اپنے ان منصوبوں پر عمل کریں جو ان کے پیشِ نظر ہیں اور جن کا وعدہ کر کے انہوں نے عوام سے ووٹ حاصل کیے ہیں۔ اب اس پارٹی کے ہر چھوٹے بڑے کارکن کا اندازِ فکر و عمل سراسر تعمیری ہونا چاہیے اور اسے اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ ملک تعمیری راستے پر گامزن ہو۔ مگر یہاں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک طرف تو اس پارٹی کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر اختلاف کرنے والوں پر برس رہا ہے اور انہیں الم ناک عذاب کی وعید سنا رہا ہے۔ دوسری طرف اس کے کارکن ملک کے اندر افراتفری کی فضا قائم کرنے میں مصروف ہیں اور ہڑتالیں کروا رہے ہیں۔ ان سب حرکتوں کا مقصد ایک ہی ہے کہ ملک کی سیاسی گاڑی جو خوش قسمتی سے جمہوریت کی پٹڑی پر کسی طرح چڑھ گئی ہے اُسے پھر پٹڑی سے اُتار دیا جائے اور ملک میں آمریت، تشدد اور لاقانونیت کی فضا قائم ہو۔ بعض سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی بعض جمہوری حکومتیں کمیونزم کو جمہوری راستے سے برسرِ اقتدار آنے میں چونکہ حائل ہوتی ہیں اس لیے اسے مجبوراً غیر جمہوری طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہ انتہائی سادگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم جمہوری طریق اور جمہوری روایات کے ساتھ کسی ملک میں اپنا تسلط قائم ہی نہیں کرنا چاہتا اور اگر کبھی اتفاقی طور پر قائم بھی ہو جائے تو وہ اُسے فوراً آمریت میں تبدیل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتا ہے۔ اس بنا پر جماعت اسلامی کے کام کو اشتراکیت کے کام پر قیاس کر کے کوئی نتیجہ اخذ کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ جماعت اسلامی تو جمہوریت ہی کو اپنے لیے مفید سمجھتی ہے۔ اسی راستے سے وہ عوام کی رائے کو اُن تبدیلیوں کے لیے بتدریج تیار کرنا چاہتی ہے جو اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے درکار ہیں، اور اس کے پیشِ نظر یہ ہے کہ رائے عام کی تربیت کر کے انتخابات کے راستے سے بالآخر اسلامی نظام قائم کیا جائے

بعض بہی خواہوں کی طرف سے جماعت کو زیادہ سرگرم اور عوامی بنانے کے لیے یہ تجویز بھی پیش کی جا رہی ہے کہ اس کی امارت کا بار کسی دوسرے زیادہ سرگرم قائد کے کندھوں پر ڈال دیا جائے اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو جماعت کی سرپرستی کا کام سپرد کر دیا جائے۔ یہ تجویز بھی ہمارے خیال کے مطابق جماعت اسلامی کے مقصد، مزاج اور طریقِ کار سے عدمِ واقفیت

کی مظہر ہے۔ جماعت اسلامی جیسی جماعت کے لیے قائد مصنوعی طور پر نہیں بنتا بلکہ وہ بالکل فطری طور پر اُبھرتا ہے۔ جماعت کی قیادت فطری طریقے سے بنی ہے۔ جذباتی اور ہنگامی فیصلوں کی بنا پر وہ نہیں بدل سکتی۔ مولانا کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے اس تحریک کو اپنے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے پروان چڑھایا ہے اور اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ پھر اول روز سے آج تک انہوں نے اس کی عملی رہنمائی بھی کی ہے۔ وہ اسے مختلف مراحل اور مختلف اَدوار سے لیکر آگے بڑھے ہیں۔ وہ اس راہ کی دُشواریوں سے جتنے واقف ہیں کوئی دوسرا واقف نہیں۔ خدا انہیں تادیر سلامت رکھے لیکن ان کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص کی عملی سربراہی سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ تحریک اسلامی کی قیادت کی نوعیت کسی سیاسی جماعت کی صدر نشینی کی سی نہیں۔ جماعت اسلامی کے ارکان ہمدرد اور متاثرین مولانا پر نہ صرف پُورا اعتماد رکھتے ہیں بلکہ انہیں ان سے والہانہ محبت بھی ہے۔ ایک ایسی محبت جس میں جذبات و احساسات کا بڑا دخل ہے اور یہ جذبات و احساسات ایک دن میں پیدا نہیں ہو گئے۔ اللہ کے ایک بندے نے برسوں کی محنتِ شاقہ، علمی فضیلت، اخلاقی برتری، تدبر، غیر معمولی ایثار، بلند حوصلگی اور دینِ حق کے لیے قید و بند کی صعوبتیں سہ کر یہ مقام حاصل کیا ہے۔ مولانا اس تحریک کے محض منتخب امیر نہیں بلکہ اس کے فطری قائد اور اپنے رفقاء کی محبت و عقیدت کا مرکز و محور بھی ہیں۔ ان کی موجودگی میں اگر کسی دوسرے شخص کو امیر بنا لیا جائے تو عجیب و غریب قسم کے مسائل پیدا ہوں گے۔ بظاہر وہ تحریک کو آگے لیکر بڑھنے کی کوشش کرے گا مگر عملاً سربراہی مولانا کے ہاتھ میں ہی رہیگی اور وہ خواہ اس سے کسی قدر دامن چھڑائیں اور امارت کی ذمہ داریوں سے خواہ کتنے گریزاں ہوں مگر اس جماعت کی قیادت کا بوجھ اُنہی کے کندھوں پر رہیگا اور جماعت کی سربراہی کا مسئلہ وہی صورت اختیار کریگا جو گاندھی جی کی قیادت نے کانگریس کے لیے پیدا کر رکھی تھی۔ اس ملک کی سیاسی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ گاندھی جی کانگرس کے عملی طور پر سربراہ تھے اور یہ جماعت ہر مرحلے پر اُن سے رہنمائی حاصل کرتی تھی۔ انکی رائے کے مطابق تمام امور کے فیصلے کیے جاتے۔ مگر اُن پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی تھی اور جب بھی انہیں کسی فیصلے سے انحراف کی ضرورت پیش آتی تو وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ یہ کہہ دیتے کہ میں تو جماعت کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں ہوں۔ ایک غیر مسلم قیادت تو اس قسم کی ڈپلومیسی سے کام لے سکتی ہے، مگر اُن قائدین کو اس عیاری کے لیے کس طرح آمادہ کیا جا سکتا ہے جو آخرت کی جوابدہی پر ایمان رکھتے ہوں۔

(باقی صـ۶۳ پر)

یہ ہے :

"مصری سربراہ (جمال عبدالناصر) نے عراق کی حکمران بعث پارٹی پر بھی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ قاہرہ کے پاس ایسے پختہ ثبوت موجود ہیں کہ عراق کے بعثی لیڈروں نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے اُس کے پسِ پردہ بین الاقوامی امپیریلزم کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اور بین الاقوامی امپیریلزم نے عراق کے ذریعہ سے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کا ہماری موجودہ جنگ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ امپیریلزم بعثیوں کے اس موقف سے فوجی، سیاسی اور اقتصادی، فوائد حاصل کر رہا ہے۔"[1]

صدر ناصر نے مشرقی محاذ پر عراقی فوجوں کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عراقی فوجوں کی وطنیت پسندی میں کوئی شبہ نہیں ہے مگر عراقی رہنما نہیں چاہتے کہ یہ فوج کوئی مؤثر کردار ادا کرے۔ صدر ناصر نے ان اختلافات کے بارے میں جو عراق کے اندر مختلف عناصر کے مابین جاری ہیں بتایا کہ بعث پارٹی نے مصنوعی طور پر اختلافات پیدا کر رکھے ہیں۔ ان اختلافات کا تعلق بنیادی مسائل سے بالکل نہیں ہے۔ بلکہ بعثی لیڈر ضمنی مسائل چھیڑ کر عراقی فوج کے مشکوک موقف پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔[2]

---

[1] یہ اقتباس جمال عبدالناصر کی اس تقریر میں سے لیا گیا ہے جو انہوں نے سوڈان کے وکلا اور ججوں پر مشتمل ایک وفد کے سامنے قاہرہ میں کی ہے۔ ملاحظہ ہو الاہرام ۱۰ ستمبر ۱۹۷۰ء۔ [2] ایضاً

(بقیہ اشارات)

مولانا محترم کو سرپرستی کے مقام پر فائز کرنے اور اُن کی جگہ زندگی سے بھرپور کسی نئی امارت کو سامنے لانے میں جس قسم کے غلط تاثرات شامل ہیں ان کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ امریکہ میں کینیڈی کی کامیابی کی وجہ ٹیلیویژن پر اس کے حسن اور توانائی کی نمائش تھی۔ اوّل تو یہ بات ہی غلط ہے۔ اگر انتخابات میں کامیابی کا راز صرف اس بات میں مضمر ہوتا تو پھر دنیا کی زمامِ کار اداکاروں کے ہاتھ میں

ہوتی۔ دوسرے امریکہ کی صدارت کے لیے انتخابی جدوجہد اور احیائے اسلام کے لیے تگ و دو میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اُس انتخابی جدوجہد کا مقصد جذباتی فضا تیار کر کے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنا ہے اور یہاں سارا معاملہ حکمت و دانائی کے ساتھ اسلام کو دنیا میں ایک غالب قوت بنانے کا ہے۔ جو چیز وہاں ہنر ہے یہاں وہ عیب ہے۔ وہاں جذبات میں ہیجان پیدا کرنا ایک خوبی ہے اور یہاں اس کی حیثیت ایک برائی کی سی ہے۔ تحریکِ اسلامی کو ترقی دینے میں بلاشبہ جذبات کا بھی ایک حصہ ہے مگر یہاں زمام کار ایک ایسے صاحبِ بصیرت کے ہاتھ میں دینے کی ضرورت ہے جو جذبات کے اندر توازن پیدا کرے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام جذبات میں اشتعال پیدا کرنے سے تو سرانجام نہیں دیا جا سکتا بلکہ اُن کے اندر ضبط پیدا کرنے سے کیا جا سکتا ہے لہٰذا اسلامی تحریک کا کوئی قائد اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اسٹیج پر تھرک کر اپنے اردگرد جذبات کا ایک ہالہ قائم کرے۔ وہ تو ہر مرحلے پر تہذیب و شائستگی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ وہ زبان کے استعمال کے معاملے میں مطلق العنان نہیں ہو سکتا بلکہ ہر لفظ کو شعور اور عقل کی معتدل میزان پر تول کر کہنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ عوام کے جذبات سے نہیں کھیل سکتا بلکہ انہیں عقل کی بات سمجھاتا ہے اور دنیا میں سستی شہرت کے حصول کے بجائے آخرت میں فلاح و کامرانی حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ جس طرح ملتِ اسلامیہ کو اقوامِ مغرب پر قیاس کرنا غلط ہے بالکل اسی طرح اس ملت کے قائدین کو مغربی قوموں کے قائدین کے معیار پر دیکھنا غلط ہے۔ آپ ان قائدین سے یہ مطالبہ تو کر سکتے ہیں کہ وہ ہمارے نامور اسلاف کا نمونہ بنیں مگر انہیں کینیڈی، ماؤ، ڈیگال، سٹالن، خروشیف اور چرچل کے نمونے بنانا سخت ناانصافی ہے۔

باقی رہا مولانا کی زیرِ نگرانی نئی قیادت کی تربیت کا مسئلہ تو مولانا خود اس کے لیے فکرمند ہیں اور اس کام کے لیے اہل افراد کو تیار کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اس ایک فطری طریقِ کار کو چھوڑ کر اگر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے اس تحریک کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح فہم عطا کرے اور اس بات کی توفیق دے کہ ہم اس تحریک کے مزاج کو سمجھنے کے قابل ہوں۔